ڈاکٹر شہباز حسین
پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد

رپورتاژ چہرے اور مہرے کا اسلوبی مطالعہ

STYLISTIC STUDY OF REPORTAGE "CHEHRE AUR MOHRE"

ASTRACT:

This article presents a stylistic study of Masood Mufti's renowned reportage *'CHEHRE AUR MOHRE'*, a work that records the historical and emotional realities of the Fall of Dhaka in 1971. Masood Mufti, a distinguished Pakistani civil servant and writer, is widely recognized for his bold expression, critical insight, and literary craftsmanship. In *'CHEHRE AUR MOHRE'*, he documents his personal observations of the political collapse, military operations, and human suffering that accompanied the disintegration of Pakistan. Unlike conventional historical accounts, Mufti's reportage blends factual narration with a highly literary diction, offering a unique stylistic fusion of journalism and literature. This paper analyzes the author's stylistic choices, such as the use of metaphorical imagery, poetic rhythm, and carefully chosen Persian, Arabic, and English vocabulary, which enrich the narrative texture of the text. His objective tone, combined with vivid descriptions and emotional intensity, reveals a style that is both realistic and artistic. Furthermore, the study situates the reportage within the broader tradition of Urdu reportage writing, highlighting how Mufti redefined the genre by merging eyewitness testimony with literary aesthetics. Ultimately, this reportage emerges not only as a historical testimony but also as a stylistic masterpiece that reflects Mufti's literary genius and his ability to transform national tragedy into enduring art.

KEYWORDS:

Masood Mufti, Urdu reportage, fall of Dacca, style, historical testimony, national tragedy.

اردو میں مستعمل لفظ ''اسلوب'' عربی زبان سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی ''طرز''، ''انداز''، ''طریقہ'' ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد مصنف کا اندازِ تحریر یا طرزِ تحریر ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں جہاں ماحول، حالات اور عصری تقاضے اپنا کردار ادا کرتے ہیں وہاں خود لکھنے والے کی اپنی شخصیت و کردار بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مصنف کی ذہنی ساخت، اندازِ فکر، تعلیم و تربیت، فطرت، ذاتی پسند و ناپسند، ذوقِ طبع اور عقیدت و رنجش بھی اس کے اندازِ تحریر میں جذب ہو جاتے ہیں، جو اس کے لکھنے کے انداز کو دوسرے لکھنے والوں کے اسلوب سے مختلف، منفرد یا ممتاز بنا دیتے ہیں۔ ایک محقق کے مطابق:

> ''مصنف کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے''۔(۱)

سید عابد علی عابد کے مطابق:

> ''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کا وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں''۔(۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسلوب کے دو بڑے عناصر ہوتے ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق پر اس کی داخلی اور ذہنی زندگی کی بھی مہر لگی ہوتی ہے''۔(۳)

اسلوب مصنف کے باطن کو نے نقاب کرتا ہے، یعنی اسلوب میں شخصیت کا پرتو آجاتا ہے اور اس کہ شخصیت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ مصنف کے میلانات، مطالعہ، میلانات، ذخیرہ الفاظ، حتیٰ کہ اس کی اہلیت و قابلیت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اسلوب محض الفاظ کا چناو یا جملوں کی ترتیب نہیں، بلکہ یہ اس بات کی جھلک پیش کرتا ہے کہ مصنف کس زاویہ نظر سے دنیا کو دیکھتا ہے۔ کس طرح سوچتا ہے اور اپنے احساسات کو کس طرح بیان کرتا ہے۔ مصنف کے الفاظ ہی اس کی علمی سطح، نفسیاتی کیفیت اور سماجی پس منظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف

اپنے موضوع کو جس انداز میں پیش کرتا ہے وہ اس کے ذہنی رجحان، دل چسپی اور اقدار کو ظاہر کرتا ہے۔ کئی مصنفین اپنے اسلوب میں لاشعوری طور پر اپنی زندگی کے تجربات کو سمو دیتے ہیں، جو ان کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یوں اسلوب ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

مسعود مفتی اردو ادب میں رپورتاژ نگاری کے حوالے سے ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب حقیقت نگاری، مشاہدے کی گہرائی اور احساسات کی شدت سے بھرپور ہے۔ انہوں نے حقائق اور سماجی شعور کو فنی حسن کے ساتھ پیش کرنے میں منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کے رپورتاژ صرف معلوماتی یا واقعاتی بیانیہ نہیں ہیں بلکہ قاری کو ایک زندہ تجربے سے گزارتے ہیں، جن میں وہ خود حالات و واقعات کا مشاہد بن جاتا ہے۔ وہ ادبی زبان کی چمک دمک سے زیادہ حقیقت کی کڑواہٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بڑے خوبصورت اور دل کش طریقے سے اپنے جذبات کو لباس کا پہناوا پہناتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں زندگی کی اصل تصویریں جھلکتی ہیں، خواہ وہ معاشرتی ناانصافی ہو یا سیاسی بحران۔ ان کے اسی اسلوب کی جھلک ان کی رپورتاژ ''چہرے اور لمحے'' میں بھی نظر آتی ہے، جو کہ مصنف کا ایک اہم اور فکری رپورتاژ ہے۔ یہ رپورتاژ سقوطِ ڈھاکا کے سانحے پر مبنی ہے۔ یہ صرف ایک تاریخی بیان نہیں بلکہ ایک فکری اور جذباتی دستاویز بھی ہے جو پاکستان کی سیاسی، سماجی اور عسکری تاریخ پر تنقیدی روشنی ڈالتی ہے۔ اس کا اسلوب مصنف کی انفرادی شخصیت، مشاہدے کی گہرائی، فکری شعور اور بیانیہ طاقت کا غماز ہے۔ مصنف اپنی اس کتاب میں ذاتی مشاہدات اور تجربات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ محض ایک رپورٹ نہیں رہتی بلکہ ایک تاریخی اور سماجی ڈاکومنٹ بن جاتی ہے۔ مصنف منظر نگاری، کرداروں کی نفسیات اور حالات کی جزئیات کو نہایت باریک بینی کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں، جو ان کی تحریر کو ایک گہرائی عطا کرتی ہیں۔ ''چہرے اور لمحے'' کا اسلوب مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

منظر نگاری

''چہرے اور مہرے'' میں منظر نگاری کے دل کش نمونے ملتے ہیں جو قاری کے نہ صرف مشاہدے کو جلا بخشتے ہیں بلکہ اسے جذباتی سطح پر بھی متاثر کرتے ہیں۔ مسعود مفتی کی اس رپورتاژ میں منظر نگاری کو ایک فنی اور فکری وسیلہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مشاہدات کو قاری کے سامنے نہ صرف مجسم کرتے ہیں بلکہ انہیں سماجی و تاریخی تناظر سے جوڑ کر ایک وسیع معنوی جہت بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کی منظر نگاری محض قدرتی عناصر کی عکاسی تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسانی چہروں کی لکیریں، لہجے، حرکات و سکنات اور حالاتِ

حاضرہ کے اثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ وہ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے حالات و واقعات اور مناظر کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں اس کا ایک تصویری خاکہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود مفتی کی منظر نگاری میں داخلی اور خارجی دونوں پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں:

> ''بارش کے بعد گلیوں میں جمع کیچڑ میں بچوں کے ننگے پاؤں، چھپ چھپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر معصوم خوشی بھی تھی اور محرومی کا کرب بھی، جیسے زندگی نے ان کے حصے میں مسکراہٹ اور آنسو ایک ساتھ بانٹ دیے ہوں''۔(۴)

مسعود مفتی کے اسلوب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی منظر کی صرف ظاہری تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ اس کے پس منظر میں موجود انسانی جذبات اور معاشرتی تلخیوں کو بھی بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے بیان کیے گئے حالات و واقعات صرف قاری کی آنکھ کو دکھائی دینے والی ایک حقیقت تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے دل کو محسوس ہونے والی ایک کیفیت بھی بن جاتے ہیں۔ پورتاژ میں جگہ جگہ پیش کیے گئے مناظر محض خارجی مناظر نہیں بلکہ داخلی معنویت کے ساتھ ایک عہد کی داستان ہیں۔ مصنف ہر منظر کو اس طرح پوری جزئیات اور تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہو بہو دکھائی دینے لگتا ہے۔ ان کے الفاظ میں ایسی تصویری قوت نظر آتی ہے کہ قاری نہ صرف منظر کو دیکھتا ہے بلکہ محسوس بھی کرتا ہے۔ یہ اسلوب بصری اور حسی دونوں سطح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً:

> ''اس نے اپنی آنکھوں سے دیواریں شق ہوتی دیکھیں۔ راکٹ پھٹتے دیکھے۔ دھوئیں ابلتے اور ملبے اڑتے دیکھے۔ ایک سنتری کو عین بمباری میں کھلی چھت پر کھڑے ہو کر پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھا۔ قالینوں پر آگ کے سانپ رینگتے دیکھے۔ بجلی کے تار اور پانی کے پائپ چاک شدہ پیٹ میں سے انتڑیوں کی طرح باہر کو لٹکتے دیکھے۔ بھاگتے ہوئے لوگوں کو دھوئیں سے بے دم ہوتے دیکھا۔ شیشے کے خوبصورت کیس میں تیرنے والی رنگین اور سنہری مچھلیوں کو ملبے کے ڈھیر میں تڑپتے، اچھلتے اور اپنے ہی خون میں اور زیادہ رنگین ہوتے دیکھا''۔(۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے بنگالیوں کے خلاف فوجی آپریشن کے منظر کو نہایت فن کارانہ اور ادبی انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے ہولناک مناظر کو محض ایک خشک بیانیہ یا اعداد و شمار کی سورت میں پیش

نہیں کیا، بلکہ بصری اور حسی جزئیات کے ساتھ اس طرح دکھایا ہے کہ قاری خود کو اس منظر کا چشم دید گواہ محسوس کرتا ہے۔ مصنف کی یہ منظر کشی نہ صرف مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی سفاکی اور شدت کو واضح کرتی ہے بلکہ سقوطِ ڈھاکا کے تاریخی پس منظر کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے:

> ''ٹرک بظاہر رینگ رہے تھے۔۔۔ مگر دراصل ان کے گھومتے پہیے بے پایاں فاصلہ بتا رہے تھے۔ بود سے نابود کے فاصلے۔ ہست سے نیست کے فاصلے۔ ٹانکا ٹانکا بخیہ ادھیڑنے کی طرح قدم بہ قدم ہمارا رشتہ زمین سے ہمیشہ کے لیے کٹ رہا تھا اور ارد گرد گزرنے والے مقامات کے سابقہ روپ لمحہ بہ لمحہ معدوم اور ناپید ہو رہے تھے''۔(۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''اداس رات۔۔۔ ویران سڑک۔۔۔ مغموم فضا۔۔۔ ہمارے ٹرک رینگ رہے تھے۔ جیسے موہوم مقدر کی ان جانی راہ پر''۔(۷)

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''چہرے اور لمحے'' محض ایک مشاہداتی اور واقعاتی رپورتاژ نہیں رہتی بلکہ معاشرتی اور تاریخی تناظر میں انسانی زندگی کی ایک کرب ناک داستان ہے، جسے مصنف نے بڑے دل کش اور اچھوتے انداز میں اپنے قلم کی زینت بنایا ہے۔

سیاسی و سماجی شعور

چہرے اور لمحے ذاتی تاثرات کا بیان نہیں، بلکہ اس میں سیاسی و سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔ درحقیقت یہ رپورتاژ پاکستان کی سیاسی تاریخ، عسکری و بیوروکریسی کے کردار، سانحہ مشرقی پاکستان اور معاشرتی زوال کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے سیاسی ناانصافی، عوامی استحصال اور فوجی و سول آمریت جیسے موضوعات پر دوٹوک انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ وہ واقعات کو محض آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کے پس منظر میں موجود سیاسی محرکات اور سماجی رویوں کو بھی اپنے قلم کی زینت بناتے ہیں۔ یہاں بنگالی عوام کے دکھ، ان کی محرومیاں اور بے بسی محض ایک جذباتی انداز میں نہیں بلکہ ایک گہرے سماجی تجزیے کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ وہ بنگالیوں کے خلاف فوجی آپریشن اور ریاستی جبر کو بے نقاب کرتے ہوئے دراصل ایک ایسے سماجی رویے پر تنقید کرتے ہیں جو طاقت کے زور پر لوگوں کے مسائل اور ان کے خلاف اٹھنے

والی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس رپورتاژ میں مصنف کا سیاسی و سماجی شعور نہ صرف ان کے مشاہدات کی گہرائی کو بڑھاتا ہے بلکہ ان کی تحریر کو ادبی حدود سے نکال کر ایک تاریخی دستاویز بنا دیتا ہے:

> ''ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ اصول یہ ہے کہ لوگ اپنے ملک کی سیاست میں انصاف برتتے ہیں اور بین الاقوامی سیاست میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں مگر ہمارے ہاں الٹ رہا ہے۔ ہم ملک کی سیاست میں صرف اپنا ذاتی مفاد دیکھتے رہے ہیں اور انصاف کو قریب نہیں بھٹکنے دیا۔ مگر بین الاقوامی سیاست میں انصاف کی دہائی دیتے رہے ہیں''۔(۸)

مصنف کا سماجی شعور بھی اسی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے، جب وہ عام انسانوں کی زندگیوں، ان کے مسائل، احساس محرومی اور سماجی ناانصافیوں کو بیان کرتے ہیں۔ طبقاتی فرق اور اشرافیہ کے رویے پر ان کی تنقید معاشرتی شعور کی بھرپور عکاسی کرتی ہے مصنف اپنے قلم سے سماج کی ناہمواریوں، سیاسی استحصال اور انسانی حقوق کی پامالی کو بے نقاب کرتے ہیں:

> ''پاکستان میں اقتدار کا یہ محور مشرقی پاکستان کو ہمیشہ اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا کیوں کہ اول تو مغربی پاکستان کے لوگ جاگیردانہ نظام تلے مسلسل پسنے کی وجہ سے عادتاً اطاعت شعار تھے اور دوسرے ان کی کئی نسلیں فوجی ملازمت سے روزی کماتی رہی تھیں۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں جاگیرداری نظام ناپید ہونے کی وجہ سے وہاں کے شہری خود بیں، خود اعتماد، بلند باگ اور سیاسی طور پر زیادہ بالغ نظر تھے''۔(۹)

> ''عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں دھونس اور دھاندلی کی جو کھلی چھٹی دی گئی تھی اسے بھی آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت کا یہ اصرار قابلِ قبول نہیں کہ وہ الیکشن بالکل شفاف اور غیر جانب دار تھے''۔(۱۰)

مسعود مفتی یہ نکتہ نظر بھی رکھتے ہیں کہ مغربی پاکستانیوں کی نسبت مشرقی پاکستان زیادہ سیاسی بصیرت کے حامل تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ جمہوریت کے بھرپور حامی تھے۔ جب کہ مغربی پاکستان میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہاں جاگیرداری نظام نے جمہوریت کی اصل روح کو دفن کر دیا تھا۔

طنز و تنقید

چہرے اور لمحے کا اسلوب بسا اوقات طنز اور تلخ حقیقت نگاری کا بھی مظہر ہے۔ مصنف نرم لہجے میں ایسی تلخ سچائیاں بیان کرتے ہیں جو قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ یہ تنقیدی شعور ان کی تحریر کو محض بیان سے نکال کر احتجاج کا درجہ دیتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف واقعات کی عکاسی کی ہے بلکہ ان کے پس منظر میں چھپی ہوئی معاشرتی، سیاسی اور انتظامی کمزوریوں پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ حکومتی و عسکری اداروں، بیوروکریسی اور سیاسی نظام کی کمزوریوں کو بڑے موثر طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ سیاست دانوں اور فوجی حکمرانوں کی خود غرضی، اقتدار کی ہوس اور عوامی مسائل سے لاتعلقی پر ہلکے مگر کاٹ دار جملوں کے ذریعے نشتر چلائے ہیں:

> ''افسوس یہ ہے کہ کسی چہرے پر وہ غرور اور فخر نظر نہیں آتا جو اپنے ملک کی بقا کے لیے آخری دم تک لڑ کر ہارنے میں ہوتا ہے۔ شاید کشتی کے ڈولنے سے پہلے ہی ان کے یقین ڈول گئے تھے۔ یا شاید اس ابتری اور دھاندلی نے انہیں پہلے ہی ادھ مواد کر دیا تھا جو پچھلے چند برسوں سے ایک عفریت کی طرح اس قوم کی ہر زندہ روایت اور جان دار ڈھانچے کو ہڑپ کر رہی تھی''۔(۱۱)

یہ بھی سچ ہے کہ مصنف کی طنز و تنقید اعتراض برائے اعتراض نہیں بلکہ اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنف نے نہایت علمی اور مدلل انداز میں معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو طنز و تنقید کے آئینے میں دکھایا ہے۔ جس سے قاری صرف محظوظ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان پہلوؤں پر سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے:

> ''ہم نے اپنے ملک کو آئیڈیولوجیکل ملک کہا اور سیکولر انداز میں چلایا۔ ہندوستان نے اپنے ملک کو سیکولر کہا اور آئیڈیولوجیکل انداز میں چلایا۔۔۔ منافق وہ بھی تھے، منافق ہم بھی تھے۔۔۔ مگر وہ ہم سے بے بہتر منافق نکلے''۔(۱۲)

اداسی و یاسیت

اس رپورتاژ میں ایک مستقل اداسی اور یاسیت کا عنصر بھی نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مصنف جن حالات و واقعات کو قلم بند کرتے ہیں ان میں مایوسی اور دل گرفتگی کا رنگ بھی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ یہ یاسیت

اور مسلسل اداسی دراصل ان تلخ حقائق اور سماجی و سیاسی ناانصافیوں کا شاخسانہ ہے جو مصنف نے قریب سے دیکھے اور محسوس کیے۔ اس میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب وہ بھارت کی قید میں گئے:

> ''سامان بند ہے۔۔۔ ریڈیو خاموش ہے۔۔۔ کمرہ اداس ہے۔۔۔ باہر خطرے ہیں۔۔۔ دل میں اندیشے ہیں۔۔۔ ایسے میں کسی چیز پر توجہ نہیں لگتی۔۔۔ میں کمرے سے باہر آجاتا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں کافی چہرے اکٹھے ہیں اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی شامل ہو جاتا ہوں''۔(۱۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے خیال آتا ہے کہ ان لمحوں کا بہترین استعمال یہ ہے کہ گھر خط لکھ ڈالوں۔ یعنی اس قسم کا خط جو میرے بعد ان کے لیے مفید ہو سکے۔ چنانچہ سامان کھول کر ذاتی کاغذ نکالتا ہوں اور بیوی کو سیدھے سادھے خط میں اپنے بنک اکاونٹ، جی پی فنڈ، انشورنس اور اسی قسم کی دوسری تفصیلات لکھتا ہوں۔ پھر یہ بتاتے ہوئے کہ میرے مستقبل کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کہ کیا ہو گا، اسے صبر کی تلقین کرتا ہوں۔ اور کھلے لفافے میں ڈال دیتا ہوں۔ ایسا ہی ایک خط والدہ محترمہ کو لکھتا ہوں''۔(۱۴)

مسعود مفتی کی یہ یاسیت ذاتی تکلیف اور غم کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی دکھ کی صورت میں بھی ابھرتی ہے، جو پورے معاشرے کی زبوں حالی کی نمائندہ ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی رپورتاژ پڑھنے والا قاری محض حالات سے آگاہ نہیں ہوتا بلکہ ایک گہری کرب ناکی اور افسردگی کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔

حقیقت نگاری

حقیقت نگاری اور سچائی کسی بھی رپورتاژ کی اصل روح اور بنیاد سمجھی جاتی ہے کیوں کہ اس سے قاری کو حالات و واقعات کا سچا اور غیر جانب دار بیانیہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ''چہرے اور مہرے'' بھی اس خصوصیت سے مالا مال ہے۔ اس میں مصنف تلخ سے تلخ سچائی کو بھی بلا جھجک اور بڑے قرینے سے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم کڑوے حقائق کو بیان کرتے ہوئے کہیں نہیں ڈگمگاتا۔ وہ بڑی بے باکی کے ساتھ اربابِ اختیار کی کوتاہیوں اور نااہلیوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ یہ وصف ان کی رپورتاژ کو ایک معتبر دستاویز بنا دیتا ہے:

''مارچ۔اپریل ۱۹۷۱ میں اس سے بھی برے دن دیکھے۔جب خود مسلمانوں کی بربریت ہندوؤں کے مظالم سے کہیں آگے بڑھ گئی۔اور اب دسمبر ۱۹۷۱ کے بعد پھر ان کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی''۔(۱۵)

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

''حصول مقصد کا بہترین بہانہ یہی ہو سکتا تھا کہ اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور دشمن سے جان بوجھ کر مصنوعی جنگ چھیڑ دی جائے اور عجلت میں ہتھیار ڈال دیے جائیں۔اس قسم کی ریاکارانہ حیلہ سازی سے اقتدار پرستوں کی ہوس کی باآسانی تسکین ہو سکتی تھی''۔(۱۶)

مصنف یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ سقوطِ ڈھاکا پاکستان کے سیاسی اور عسکری اکابرین کی ملی بھگت سے ہوا تھا۔وہ اس رائے کا اظہار برملا اپنی کتاب میں کرتے ہیں اس سانحے کے ذمہ داران کو کڑی سزا دینے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

تشبیہات واستعارات کا استعمال

مسعود مفتی کا اسلوب ہمہ خوبیوں کا حامل ہے۔اپنے جذبات واحساسات کو الفاظ کا رنگ دینے اور قاری کو سمجھانے کے لیے اپنی رپورتاژ میں جابجا تشبیہات کا استعمال بھی بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ان کا یہ فن ان کے اندازِ بیاں اور وقائع نگاری کو مزید نکھار دیتا ہے۔انہوں نے محض حقائق بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے کرداروں، مناظر اور حالات وواقعات کو زیادہ موثر اور جاندار بنانے کے لیے ادبی اظہار کے یہ حربے بھی استعمال کیے ہیں:

''گورنمنٹ ہاوس کا ہیولا اندھیرے میں ابھرا۔۔آہستہ آہستہ قریب آیا۔۔۔اور پھر ہمیشہ کے لیے ہم سے کٹ گیا۔جیسے شاخ درخت سے گر جائے''۔(۱۷)

چہرے اور لمحے، ص۸۰

ایک اور مقام پر تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفٹ جلاہے کی کھڈی میں بھاگنے والے شٹل کی طرح اوپر نیچے چکر لگاتی رہتی ہے۔ اور نیچے لاونج آہستہ آہستہ مردوں، عورتوں، بچوں اور سامان سے ایسے بھرنے لگتا ہے جیسے آٹے کی مشین پر بوری لبالب بھر جاتی ہے''۔(۱۸)

اسی طرح:

''میں ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے جھانکتا ہوں۔ دس پندرہ سال کے لڑکے کندھوں سے سٹین گن لگائے مست ہاتھیوں کی طرح سڑک پر گھوم رہے ہیں''۔(۱۹)

درحقیقت وہ مشرقی پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کو بیان کرتے ہوئے ان کو ایسے مجروح جسم سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے زخم ہنوز تازہ ہوں۔ ان کے اس انداز سے پڑھنے والے کو بھی حالات کی شدت کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے اور تمام مناظر ایک عینی شکل میں قاری کے ذہن میں زندہ ہو جاتے ہیں۔

انگریزی الفاظ کا استعمال

چہرے اور مہرے میں وقتاً فوقتاً انگریزی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مصنف ایک بیوروکریٹ تھے اور انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک تعلیم یافتہ اور وسیع المطالعہ ادیب بھی تھے اس لیے ان کی تحریر میں انگریزی زبان کے ایسے الفاظ و تراکیب پڑھنے کو ملتے ہیں جو عبارت کو نہ صرف جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں بلکہ قاری کو عالمی فکری اور تہذیبی پس منظر سے بھی جوڑ دیتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کے استعمال میں ان کا انداز نہ تو مصنوعی محسوس ہوتا ہے اور اور نہ ہی غیر ضروری محسوس ہوتا ہے بلکہ اس قدر سلیقے اور روانی سے اپنی تحریر میں برتتے ہیں کہ وہ متن کا حصہ بن کر معنی کو زیادہ واضح، جامع اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔ یوں ایک طرف ان کی نثر میں روایتی اردو اور فارسی کا ادبی حسن برقرار رہتا ہے اور دوسری طرف انگریزی الفاظ کی شمولیت اسے عصری شعور اور فکری تازگی عطا کرتی ہے۔ یہی امتزاج ان کے اسلوب کو نہ صرف منفرد بناتا ہے بلکہ اسے قاری کے لیے زیادہ بامعنی اور ہمہ جہت بھی کر دیتا ہے۔

کئی مقامات پر وہ ان انگریزی الفاظ کو انگریزی ہجوں میں لکھتے ہیں اور کئی صفحات پر اردو ہجوں میں۔ مصنف انگریزی الفاظ کا استعمال تو بخوبی کرتے ہیں مگر ان کے معنی یا ترجمہ کہیں نہیں درج کرتے، جو انگریزی سے نابلد قاری کے لیے مشکل پیدا کرتا ہے:

''میں دو تین دن مختلف وقتوں میں ان کے سامان پر ریسرچ کرتا رہا۔ بالآخر نظر انتخاب ان کے ریڈیو پر ٹھہری۔ جس کے اندر کے پرزے بھی ''سٹین لیس'' جیسے تھے۔ کافی مشکل کے بعد وہ کیمرہ ''سکاچ ٹیپ'' کی مدد سے اور دیگر پرزوں کو ڈھیلا کر کے دوبارہ کسنے کے عمل میں ایسے پھنسا دیا گیا کہ وہ بالکل ریڈیو کا حصہ نظر آتا تھا''۔(۲۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔تو یہ سیکولر سوشلسٹ سٹیٹ آف بنگلا دیش ہے''۔(۲۱)

مصنف انگریزی الفاظ کا استعمال اپنے اردو جملوں میں اتنی خوبصورتی اور سلیقے سے کرتے ہیں کہ قاری کو ہر گز گماں نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ کسی غیر زبان کے ہیں۔ بلکہ ان کا یہ انداز جملوں میں مزید تاثیر اور جاذبیت پیدا کر دیتا ہے۔

فارسی الفاظ کا استعمال

انگریزی کی طرح فارسی الفاظ کا استعمال بھی جابجا اور بر محل ملتا ہے۔ بعض صفحات پر تو مصنف فارسی کے اشعار یا کوئی مصرع بھی درج کر دیتے ہیں، جو ان کے فارسی زبان اور شاعری سے لگاو کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دورانِ مطالعہ فارسی زبان کی چاشنی اور شیرینی قاری کو مسلسل ایک ادبی اور جمالیاتی فضا میں رکھتی ہے۔ یہ بھی عیاں ہے کہ مصنف فارسی الفاظ کو محض نمائش کے لیے یا اپنی علمیت جھاڑنے کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کا انتخاب ہمیشہ سیاق و سباق کے مطابق ہوتا ہے۔ جس سے نہ صرف عبارت میں حسن اور روانی پیدا ہوتی ہے بلکہ معنی میں وسعت اور گہرائی بھی آتی ہے۔

''صدر کی طرف سے جنگ جاری رکھنے کے عزم کے باوجود اگلے دن جنگ بندی ہو جاتی ہے۔ جب جمہوریت نہ ہو تو لوگ ہر چیز کو ''رموز ملکیت خویش خسرواں دانند'' کہہ کر خاموشی سے منظور کر لیتے ہیں''۔(۲۲)

بعض مقامات پر وہ موقع محل کے مطابق فارسی کے اشعار یا شعر کا کوئی مصرع بھی لکھ دیتے ہیں:

عدد شرے برانگیزد کہ خیرے مادر آں باشند(۲۳)

فارسی الفاظ کے ذریعے ان کی نثر میں ایک طرف روایت اور کلاسیکی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف فکری باریکی اور تہذیبی رچاو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں فارسی الفاظ کا استعمال قاری پر ایک بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ الفاظ جملے کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جیسے معنی کی تکمیل انہی کے ذریعے ممکن ہو۔ اس اسلوبیاتی خصوصیت نے مسعود مفتی کی تحریروں کو ایک ایسا جمالیاتی تاثر دیا ہے جو نہ صرف اردو نثر کی کلاسیکی روایت سے رشتہ جوڑتا ہے بلکہ اسے معاصر اظہار کے لیے بھی زیادہ بلیغ اور موثر بناتا ہے۔

حقیقت نگاری

حقیقت نگاری اور سچائی کسی بھی رپورتاژ کا ایک بنیادی خاصہ ہوتا ہے۔ چہرے اور مہرے اس پیمانے پر ہر لحاظ سے پوری اترتی ہے۔ یہ خصوصیت مصنف کے اسلوب کو نہ صرف معتبر بناتی ہے بلکہ قاری کے لیے اسے ایک عینی تجربے کی حیثیت بھی عطا کرتی ہے۔ مصنف حالات اور واقعات کو کسی قسم کی بناوٹ، مبالغے یا تصنع کے بغیر عین اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہ ان کے مشاہدے یا تجربے میں آئے۔ یہی سچائی ان کی تحریروں کو صرف ادبی دائرے تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ انہیں ایک تاریخی دستاویز کا درجہ دے دیتی ہے۔ ان کی حقیقت نگاری میں نہ صرف خارجی حالات کی عکاسی ملتی ہے بلکہ انسانی جذبات، دکھ، کرب اور محرومیوں کو بھی اصل سچائی اور شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں، سیاسی تلخیوں اور سماجی مسائل کو بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری کو نہ صرف ان کی اصل تصویر دکھائی دیتی ہے بلکہ اس کے اثرات دل پر بھی نقش ہو جاتے ہیں:

> ''دوست ممالک کے انتباہ کے باوجود جس بے حسی اور لاپرواہی سے ہندوستانی خطرے کو دانستہ نظر انداز کیا گیا تھا اس پر ہم حیرت میں ڈوبے رہ جاتے ہیں۔ شاید وہ فوجی حکومت کی اصل نیت کا غماز تھا کہ اگر مشرقی پاکستان مستقل طور پر اطاعت گزار نہیں بنتا تو بہتر یہی ہے کہ ہم خود ہی اس صوبے سے نجات حاصل کر لیں۔ تاکہ پھر مغربی پاکستان کے تن آسان سیاست دانوں پر بلا خوف و خطر ہماری حکومت جاری رہ سکے''۔ (۲۴)

مسعود مفتی کے قلم کا کمال یہ ہے کہ وہ تلخ سے تلخ حالات کو بھی بیان کرتے وقت غیر جانب دار رہتے ہیں۔ یوں قاری کو ان کی تحریر میں کسی فرد، مخصوص طبقے یا گروہ کے خلاف تعصب نہیں ملتا بلکہ ایک ایسی بے لاگ حقیقت نگاری ملتی ہے جو اسے سوچنے اور حالات کی تہہ تک جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہی عنصر ان کے اسلوب کو دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کرتا ہے اور ان کی تحریروں کو ادبی اور فکری دونوں سطحوں پر منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

اردو شاعری کا استعمال

''چہرے اور مہرے'' میں شاعری کا استعمال بھی جابجا نظر آتا ہے۔ جس سے نہ صرف مصنف کے شعری ذوق کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ قاری کی دل چسپی بھی بڑھتی ہے۔ مصنف شاعری کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو مزید گہرائی اور تاثیر بخشتے ہیں۔ وہ اشعار کو محض حوالہ دینے کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ انہیں موضوع کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ نثر میں ان اشعار کے استعمال سے ایک فطری حسن اور فکری بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے شامل کیے گئے اشعار پڑھنے والے کو نہ صرف فکری سطح پر جھنجھوڑتے ہیں بلکہ جذباتی حوالے سے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یوں ان کی نثر ایک طرف حقیقت نگاری کا خوب صورت نمونہ بن جاتی ہے اور دوسری طرف شعری لطافت کے امتزاج سے قاری کو جمالیاتی لطف بھی فراہم کرتی ہے:

وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں (۲۵)

گوداں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی (۲۶)

بعض مقامات پر مصنف پورا شعر لکھنے کی بجائے صرف ایک مصرع لکھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں:

یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (۲۷)

تصویری عکاسی

مسعود مفتی کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ محض لفظوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ تصویری عکاسی کے ذریعے بھی حالات کو بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چہرے اور مہرے کے آخر میں ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے مختلف عمارتوں اور مقامات کے تصویری عکس بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تصویریں قاری کے

سامنے محض ایک سجاوٹ کے طور پر سامنے نہیں آتیں بلکہ وہ متن کے ساتھ جڑ کر واقعات اور کیفیات کو زیادہ واضح اور موثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ یہ تصویریں ایک طرف قاری کے تخیل کو مہمیز کرتی ہیں اور دوسری طرف مصنف کے بیان کردہ حقائق کی صداقت کو بصری ثبوت کے طور پر اجاگر کرتی ہیں۔ یوں مصنف کا اسلوب محض بیانیہ نہیں رہتا بلکہ ایک مکمل بصری اور فکری تجربہ بن جاتا ہے جو قاری کو تحریر کے ساتھ گہرائی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

زبان و بیان اور الفاظ کا چناو

چہرے اور مہرے میں مصنف کا اندازِ بیاں اور الفاظ کا چناو ان کے فکری وقار اور ادبی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی یہ تحریر عامیانہ پن سے یکسر پاک اور سنجیدہ ادبی وقار کی حامل ہے۔ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو نہ صرف موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ قاری پر بھی ایک گہرا تاثر چھوڑتے ہیں:

> ''مگر آج شہر کی ہر بجلی چیخ چیخ کر روشنی لٹا رہی ہے، اس کی شعاعوں میں شوخیاں ہیں۔ اس کی چمک میں نخرے اور غمزے ہیں۔۔۔ اس کی ہر کرن ہمارا منہ چڑا رہی ہے۔ مضحکہ اڑا رہی ہے اور تازیانے سونت رہی ہے۔۔۔ دو ہفتے کی گھٹاٹوپ تاریکی کے بعد پاور ہاوس سے بجلی کی تھرکتی ہوئی لہر نکلی ہے۔ مگر اس کی روشنی در و دیوار تو منور کر رہی ہے لیکن ہمارے دلوں کی تاریکی دور نہیں کر سکی۔ وہ ظلمت تو ہر لحظہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے''۔(۲۸)

مصنف کے اسلوب میں دیگر خصوصیات کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا حسن بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ زبان و بیان میں ایک ایسی نرمی اور تہذیب پائی جاتی ہے جو بیانیے کو محض رپورتاژ کے درجے سے بلند کر کے ایک ادبی تخلیقی کا روپ دے دیتی ہے۔ وہ عام بول چال کے فقروں کی بجائے ایسے جملے تراشتے ہیں جن میں معنوی گہرائی اور تاثیری قوت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے:

> ''جتنی باہر چمک ہے اتنا ہی اندر کا اندھیرا سیاہ ہے۔ لوگوں کی آنکھیں قمقموں کے اجالے سے چندھیا رہی ہیں اور ہماری آنکھیں اس اجالے کے داغوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ ایک تکلیف دہ احساس ہمیں مسلسل کچل رہا ہے کہ یہ روشنی اب ہماری نہیں رہی۔ ہم اب اس

کے پروانے نہیں بن سکتے۔ یہ الگ چمکے گی، ہم الگ تڑپیں گے۔ سوز کے رشتے ختم ہوئے، وفا کے پیمانے ٹوٹ گئے۔ اس کی محفل سونی ہوئی، ہماری دھڑکن سرد ہوئی"۔(۲۹)

ان کی تحریر میں الفاظ کا استعمال محض اظہار کے لیے نہیں بلکہ باقاعدہ ایک فکری شعور کے تحت کیا گیا ہے جس سے نہ صرف متن کی معنوی گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ قاری پر اس کے تاثرات بھی زیادہ موثر ہو جاتے ہیں۔ اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب محض ایک رپورتاژ نہیں بلکہ ادبی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔ ان کے اسلوب کی یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

حب الوطنی کے عناصر

پاکستان سے والہانہ محبت اور اس کی بقا و سلامتی کے لیے فکر مندی کا اظہار بھی جابجا ملتا ہے، جو مصنف کے جذبہ حب الوطنی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے سقوطِ ڈھاکا جیسے کرب ناک سانحے کو بیان کرتے ہوئے محض ایک مبصر کا کردار ادا نہیں کیا بلکہ ایک ایسے محبِ وطن لکھاری کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنے وطن کے دکھ اور صدمے کو ذاتی کرب کی طرح محسوس کرتا ہے۔ ان کے الفاظ اور جملوں سے یہ بات صاف جھلکتی ہے کہ وہ پاکستان کو صرف ایک ریاست کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتے ہیں:

"اس قوم کی بیٹیوں کو یہ ترغیب دی جاتی تھی کہ اپنے ماتھے کے آنچل کو پرچم بنالیں۔ مگر اس قوم نے اپنا پرچم جلادیا اور بیٹی کا ماتھا داغدار کر دیا"۔(۳۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"آج کل پاکستانی فرد میں شعور کی ابتدائی بیداری تو ہے مگر ابھی وہ بالغ نظر نہیں ہے جو اسے اپنے ووٹ کی اصل اہمیت اور احتسابی قوت سے آگاہ کر سکے۔ موجودہ سیاسی کلچر اور اس کلچر کی اجارہ دار موروثی قیادت کی اصلیت پرکھنے کی بصیرت دے سکے اور اپنی نجات کے لیے بالکل نئی راہیں تلاش کرنے پر آمادہ ہو سکے"۔(۳۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسعود مفتی کی رپورتاژ **"چہرے اور مہرے "** اسلوب، فکر اور موضوع کے اعتبار سے اردو رپورتاژ نگاری کی روایت میں ایک منفرد اور وقیع مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا اسلوب محض واقعاتی بیان تک محدود نہیں رہتا بلکہ حقیقت نگاری، منظر نگاری، سیاسی و سماجی شعور، طنز و تنقید، یاسیت، حب الوطنی اور جمالیاتی حسیت کے امتزاج سے ایک گہرے فکری اور انسانی تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مسعود مفتی کی نثر میں تشبیہات و استعارات، اردو، فارسی اور انگریزی الفاظ کا بر محل استعمال، شعری حوالوں کی شمولیت اور بصری عکاسی نے متن کو فنی وقار اور معنوی وسعت عطا کی ہے۔ ان کی حقیقت پسندانہ اور بے لاگ نگاہ سقوطِ ڈھاکا جیسے المناک قومی سانحے کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے ایک زندہ سماجی و اخلاقی دستاویز میں ڈھال دیتی ہے۔ مصنف کا اسلوب قاری کو نہ صرف حالات و واقعات سے آگاہ کرتا ہے بلکہ اسے فکری طور پر جھنجھوڑتا، جذباتی سطح پر متاثر کرتا اور قومی شعور کی تشکیل میں شریک کر لیتا ہے۔ یوں **"چہرے اور مہرے "** اردو ادب میں رپورتاژ کو محض صحافتی صنف کے بجائے ایک باوقار ادبی اور فکری اظہار کے طور پر مستحکم کرتی ہے اور مسعود مفتی کو اس صنف کے ایک اہم، باخبر اور صاحبِ اسلوب لکھاری کے طور پر نمایاں کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، طاہرہ۔ منٹو کا اسلوب، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷

۲۔ عابد، عابد علی، سید۔ اسلوب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲

۳۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر۔ طیفِ نثر، لاہور: مرتبہ: ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹

۴۔ مفتی، مسعود۔ چہرے اور مہرے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۳۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۸

۶۔ ایضاً، ص ۸۰

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۷۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۳

- Iqbal, Tahira. *Manto ka Saloob*, Lahore: Fiction House, 2012, s. 17
- Abid, Abid Ali, Syed. *Asloob*, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2001, s. 42
- Abdullah, Syed, Dr. *Taif-e-Nasr*, Lahore: Murattib: Mumtaz Mangalori, Lahore Academy, 2004, s. 29
- Mufti, Masood. *Chehre aur Mehre*, Islamabad: Dost Publications, 2014, s. 37
- Ibid, p18
- Ibid, p 80
- Ibid, p
- Ibid, p 39
- Ibid, p 103
- Ibid, p 153
- Ibid, p 27
- Ibid, p 29
- Ibid, p 58
- Ibid, p 59
- Ibid, p 32
- Ibid, p 103
- Ibid, p 80
- Ibid, p 76
- Ibid, p 72
- Ibid, p 88
- Ibid, p 77
- Ibid, p 70
- Ibid, p 80
- Ibid, p 98
- Ibid, p 25
- Ibid, p 76
- Ibid, p 83
- Ibid, p 73

کتابیات

۱۔ مہدی، میاں افراسیاب۔ ۱۹۷۱ سقوط ڈھاکا حقیقت کتنی افسانہ کتنا،، اسلام آباد: خورشید پرنٹرز،، ۲۰۱۸ء

۲۔ صدیق سالک۔ میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۶ء

۳۔ مسعود، مفتی۔ لمحے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۴۔ عابد، عابد علی، سید۔ اسلوب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء